ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.2(2024)
(April to June)

محمد حمید شاہد کے افسانوی مجموعے "مرگ زار" اور دہشت میں محبت" کا نائن الیون کے تناظر میں تحقیقی و تنقیدی جائزہ

A research and critical review of Muhammad Hameed Shahid's fictional collection "Marg Zaar" and" Dehshit mein Mohabbat" in the context of 9/11

محمد سلیم سرور

پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو، نمل، اسلام آباد

ڈاکٹر نازیہ ملک

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

Muhammad Saleem Sarwar
Ph.D Research Scholar, Department Urdu, NUML, Islamabad.
chandbhatti187@gmail.com
Dr. Nazia Malik
Assistant Professor, Department Urdu, NUML, Islamabad.
nmalik@numl.edu.pk

Abstract:
Muhammad Hameed Shahid has shown so much subtlety in his fictions that the reader who reads these works of art is also divided into two groups, the lucky reader may be silent only with an external impression, but the one who has an understanding of literature. And the reader who looks into the innerpart of the works of art will discover a world of meaning from each line of these works of art. How far the so-called America has fallen from the standards of humanity.The US blamed some weak Muslim countries for the 9/11 incident without any authentic evidence and then used all kinds of negative tactics to harm these countries. Should be taken and on the other hand the Muslim countries with important sea routes should be controlled so as to dominate the world.

Keywords: Short story,9/11 incident ,Pakistani society,Amricans, humanity, Muslim countries, dominate

اُردوافسانے کی روایت کی بات کی جائے تو ہمارے سامنے تقریباً سواسوسال کا ایک قصہ پارینہ،درینہ اور حسینہ موجود ہے۔اردوافسانے کے آغاز میں منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور علامہ راشد الخیری جیسے گنے چنے نام سامنے آتے ہیں مگر جونہی اس مختصر کہانی نے اردوزبان کے مزاج سے شناسائی کی اور پھر اردوزبان کے قارئین کے مزاج کے مطابق بن سنور کر نقشے پر آنا شروع کیا تو بہت جلد اپنا مقام پیدا کرلیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اگرچہ اردو افسانہ کہانی کاروں اور موضوعات کے حوالے سے قابلِ شمار حد تک آگے بڑھا لیکن بیسویں صدی کے نصف دوم میں جب یہ کہانی اور کہانی کار داخل ہوتے ہیں تو ان کے سرمایہ ءحیات اور سرمایہ ءالفاظ میں اس قدر زرخیزی پیدا ہوچکی تھی کہ کہانی میں اب کہانی کار کے قلم سے لے کر قاری کی نظر تک ناقابل شمار حد تک وسعت پیدا ہوچکی تھی۔کوئی بھی کہانی کار تجربے کے معاملے میں ذاتی اور باطنی ہوسکتا ہے مگر مشاہدے کے معاملے میں وہ مجموعی اور خارجی

ضرور ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کا اختتام ایسا تھا جس نے قلم سے لے کر نظر تک سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بیسویں صدی کے افسانے کے موضوعات پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس پر مزید لکھنا پرانے اوراق کو نئے صفحے پر منتقل کرنے کے مترادف ہی ہو گا۔ مرزا حامد بیگ اپنی کتاب ''اردو افسانے کی روایت'' میں افسانے کے ابتدائی دور کی تاریخ کو یوں سمیٹے ہیں:

> ''راشد الخیری، یلدرم اور پریم چند سے ہوتا ہوا اردو افسانہ اصلاح پسندی، رومان، حب الوطنی اور لینن کی ہمنوائی کے بعد منٹو اور بیدی کے اہم سنگ میل گزار کر تقسیم کی اڑائی ہوئی دھول کے بیٹھ جانے کے بعد رواں پس منظر کے سہل پسند افسانہ نگاروں کی اخباری رپورٹنگ تک آ پہنچا، تب بھی نقاد نے جھرجھری نہیں لی۔ ایسے میں انتظار حسین اور قرۃ العین بولے تھے۔ انہوں نے تبدیل ہوتے ہوئے منظر نامے اور نئی نفسی کیفیات کا مسئلہ اٹھایا تو، لیکن سمت نمائی نہیں کی، اس وقت تک ''جدیدیت کی اصطلاح'' رائج نہیں ہوئی تھی۔ کاش ایسے میں کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، ممتاز حسین اور سلیم احمد اس طرف متوجہ ہوتے۔ بہر طور کڑا وقت گزر گیا۔''(۱)

ترقی پسند تحریک اردو افسانے کی تاریخ میں دروازے پر لگی نیم پلیٹ کی سی چیز ہے مطلب جس کی اپنی پوری پہچان ہے، اس نیم پلیٹ نے دیوار و در کا خوب تعارف کروایا۔ اسی دور میں عصمت چغتائی اور منٹو دو ایسے نام بھی سامنے آتے ہیں جن لوگوں نے انسانی امراض کا خوب پوسٹ مارٹم کیا اور تمام خلیات کو واضح طور پر الگ الگ کر کے دکھایا مگر اس پوسٹ مارٹم کو دیکھ تو سب لیتے ہیں مگر سمجھتے صرف روح کے ڈاکٹر ہی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ کتاب ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' میں شامل مضمون میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''بہر کیف قاری کو منٹو کے افسانے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے نڈر اور بیباک شخص سے کہانی سن رہا ہے جس نے بہت سے پردے نوچ کر الگ کر دیے ہیں تاہم اسے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ شخص انکشاف و عرفان کے مراحل سے بھی آشنا ہے اور زندگی کی مخفی کروٹوں کا نباض بھی ہے۔''(۲)

بیسویں صدی کا نصف دوم تقسیم، ہجرت، ظلم و ستم اور آبادکاری جیسے موضوعات پر مشتمل تھا۔ بیسویں صدی کے نصف دوم کو افسانے کی ترقی کے لحاظ سے افسانے کا سنہری دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو افسانے فکری اور فنی لحاظ سے خوب ترقی کی تھی۔ بیسویں صدی کے نصف دوم میں جو افسانہ نگار سامنے آئے ان میں سے کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، رجندر سنگھ بیدی اور انتظار حسین ایسے نام ہیں جن کا نام افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے افسانے کو فکر کی گہری وادیوں کی سیر کروانے کے ساتھ ساتھ فن کی بلندیوں پر بھی پہنچا دیا۔ محمود ہاشمی اپنے ایک مضمون ''تخلیقی افسانہ کا فن'' میں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہی وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے افسانے کے تخلیقی فن کو پہچانا ہے:

> ''انتظار حسین نے افسانے کی غیر تخلیقی حالت کو بھی محسوس کیا اور اپنی راہ بھی خود تلاش کرنے کی جستجو کی ہے۔ انھیں غالباً دیگر افسانہ نگاروں کی نسبت اس حقیقت کا زیادہ ایقان ہے

کہ اردو افسانہ ابھی تخلیق اور فن کے دائرے میں نہیں آیا ہے۔ یہ جو قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں کی انفرادی اجنبیت ہے، اسی میں تو اصل تخلیقی افسانے کے جوہر موجود ہیں۔"(۳)

اکیسویں صدی کے افسانوں کے موضوعات میں اس قدر تنوع اور رنگا رنگی کا عالم ہے کہ جہاں افسانے کا ہر لفظ زبان لیے ہوئے نظر آتا ہے وہیں قاری کی آنکھ بھی منصف کا ترازو نظر آتی ہے۔ اردو افسانے نے موضوعات کے حوالے سے خوف زدہ غزال کے سے جو ڈگ بھرے ہیں تو اس کے پس پردہ جو بہت سی وجوہات ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میڈیا کی ترقی کی بعد دنیا نے ایک گاؤں کی سی صورت حال اپنالی ہے۔ بیسویں صدی کے افسانہ نویس سے جہاں کوئی موضوعات چھپے رہتے تھے یا سادہ لفظوں میں یوں کہا جائے کہ بیسویں صدی میں جہاں ایک خطے کے رسم ورواج دوسرے خطے کے رسم ورواج سے مختلف تھے اور وہیں ان واقعات سے کسی ایک خطے میں بننے والی ادبی تصویر کے رنگ بھی مختلف ہوتے تھے۔ اکیسویں صدی میں انٹرنیٹ نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنادیا ہے وہیں اس گلوبل ویلج کی شبیہ کے اثرات ونتائج کو بھی بہت حد تک یکساں رنگ دے رہے ہیں۔ گلوبل ویلج کی صورت اختیار کرنے سے افسانے کے قاری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

اکیسویں صدی کے افسانے میں علامت کے استعمال کی وجہ سے لفظوں نے معنی کا پہلے سے قدرے زیادہ بوجھ اٹھا لیا ہے۔ قاری حظ کے ساتھ ساتھ واقعات کے پس پردہ جہان میں بھی جھانک سکتا ہے۔ افسانے نے بدلتے مسائل ووسائل سے خوب آنکھ ملائی ہے۔ اکیسویں صدی کا افسانہ سائنس، نفسیات اور کمپیوٹر کے میدانوں میں قاری کو لے کر گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانے میڈیا کے اثرات کی وجہ سے عالمی اثرات کو اپنے اندر خوب سمویا ہے۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جو نو آبادیاتی نظام سامنے آیا تھا اس میں زیادہ تر مادی حصول، زمینی قبضے اور اقتدار کی ہوس شامل تھی مگر جب عالمی میڈیا نے اپنے اثرات دکھانا شروع کیے اور دنیا ہر خطے میں بسنے والے شخص نے شعور کی آنکھ کھولی تو نو آبادیاتی نظام کی مروجہ نظام کو جاری رکھنے میں نہ صرف مشکل پیش آئی بلکہ ناممکن دکھائی دینے لگا۔ طاقت ور طبقے کے لیے نو آبادیاتی نظام کو قائم رکھنے میں مشکلات پیش آنے لگیں تو طاقت ور طبقے نے کمزور ریاستوں پر اپنا جبر وتسلط قائم رکھنے کے لیے کچھ نئے طریقے دریافت کیے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کمزور ریاستوں یا پھر ترقی پذیر ریاستوں میں اندرونی خانہ جنگی کا ماحول بھرپا کر دیا۔ اندرونی خانہ جنگی کے لیے کمزور ریاستوں کے افراد کو خریدا اور ان سے ان کے اپنے وطن اور اپنے ہم وطنوں کے خلاف کام لیا۔ ان طاقت ور ریاستوں میں امریکہ سر فہرست ہے۔ اکیسویں صدی کے ربع اول کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ اس طاقت ور ریاست نے دنیا بھر اور خاص کر ایشیا کی کمزور ریاستوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے کیا کیا حربے اختیار کیے۔

اکیسویں صدی کے اردو افسانہ نگاروں کو دیکھا جائے تو ان میں سے تقریباً ہر کسی نے اس موضوع پر کسی نہ کسی طرح خامہ فرسائی کی ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں سے ایک نام محمد حمید شاہد ہمارے موضوع کا حصہ ہے۔ محمد حمید شاہد اردو ادب کے مترجم، تنقید نگار، ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ موصوف افسانہ نگار نے بیسویں کے آخر اور اکیسویں صدی آغاز میں دنیا بھر میں بھرپا ہونے والے مظالم کو غائر نگاہ سے دیکھ رکھا ہے اس لیے ان کی تحریروں میں ایسی باتوں کا بیان وقت کی ضرورت لگتا ہے۔ موصوف افسانہ نگار کا افسانوی مجموعہ "مرگ زار" ہمارا موضوع ہے۔ مرگ زار کے تناظر میں ہم دیکھتے ہیں عالمی جنگ وجدل کے اردو افسانے پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری کے متعلق احمد ندیم قاسمی ان کے افسانوی مجموعے "مرگ زار" پر اپنی تنقیدی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد حمید شاہد نے سچی اور کھری زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ کہانی کہنے کے فن پر حیرت انگیز طور پر حاوی ہے۔ اس کے افسانوی کے ہر دار کو زندگی کے اثبات یا نفی، مسرت یا محرومی کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان افسانوی کا ایک ایک کردار ایک ایک لاکھ انسانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔"(۴)

امریکہ میں مسلمانوں کی بدحالی:

جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی مثل کے مصداق طاقت ور پوری دنیا کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے تو پھر بھر وہ گردن زدنی کو کجا زیر اعتاب بھی نہیں ہوتا اور کسی کی نظر میں مورد الزام بھی نہیں ٹھہرایا جاتا مگر کمزور کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے کہ کمزور جس خطے سے تعلق رکھتا ہے، اس خطے کے کسی آدمی پر شبہ پر ہو تو اس پورے علاقے کو زیر عتاب لا کر ظلم کی چکی میں پیسنا معمولی سی بات ہے۔ نائن الیون ایک ایسا واقعہ ہے جو طاقت ور کی سرزمین پر ہوا اور وہ طاقت ور بھی عصر حاضر کا سپر پاور امریکہ تھا۔ امریکہ کے تحقیقی و تفتیشی اداروں نے اس واقعے کے شکوک و شبہات کا پلندہ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ایشیائی مسلم ممالک پر لاد دیا۔ اس واقعے کے بعد اکثر ایشیائی مسلم ممالک امریکہ کے زیر عتاب رہے اور سچ تو یہ ہے دہشت گردی کا لیبل لگوا کر مسلمان آج تک امریکہ کے زیر عتاب ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعے کی نشاندہی محمد حمید شاہد اپنے افسانے "گانٹھ" میں یوں کرتے ہیں:

"جب اسے ایک انوسٹی گیشن سنٹر سے نکال کر ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ اس پر شبہ کیا گیا تھا۔۔۔ مگر کیوں؟؟۔۔۔ آخر کیوں؟؟؟۔۔۔ وہ جتنا سوچتا۔۔۔ اتنا ہی الجھے جاتا۔ ممکن ہے ایک ایشیائی ہونا اس کا سبب ہو۔۔۔ نہیں، شاید ایک پاکستانی ہونا۔۔۔ یا پھر ہو سکتا ہے مسلمان ہونا ہی شک کی بنیاد بن گیا ہو۔۔۔ مگر؟۔۔۔ مگر؟۔۔۔"(۵)

ایشیا، مسلمان اور پاکستان یہ تینوں ایسے نام تھے جو امریکہ کی نظر میں مجرم کی حیثیت رکھتے تھے۔ موصوف افسانہ نگار نے بھی اپنے افسانے گانٹھ میں ایک ایسے ہی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے جب ایک امریکی شہری کو صرف مسلمان اور پھر پاکستانی ہونے کی وجہ سے ملک سے نکال دیا۔ دنیا بھر میں خود کو انسانیت کا علمبردار کہلوانے والا امریکہ اپنے شہری کو دفاعی حقوق دینے کی بجائے اس کی موروثی، علاقائی اور نظریاتی پہچان کی وجہ سے ملک سے نکال باہر کرتا ہے۔ امریکہ نے اس طرح ایک شخص کی تذلیل نہیں کی بلکہ ایک مذہب اور ملک کی توہین کی ہے۔ اس طرح کے عمل سے صرف کھوکھلی نعرے بازی باقی رہ جاتی ہے اور حقیقت معدوم ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کا یہ ہونا یقینی تھا کیونکہ مسلمان باطنی طور پر اس قدر کمزور پڑ چکے تھے کہ ایمان پر مادیت کو ترجیح دینے لگے تھے۔

ایمان پر مادیت کو ترجیح:

ایمان ایک ایسی طاقت ہے جس نے انسان کو دنیا میں ہی نہیں بلکہ آخرت میں صلہ لافانی دینے کی ضمانت دے رکھی ہے۔ مگر جب انسان اس مقدس جذبے سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے لیے دنیا و آخرت کی رسوائی لکھ دی جاتی ہے۔ محمد حمید شاہد بھی ایک ایسے ہی ڈاکٹر کی کہانی بیان کرتے ہیں جو دنیا کمانے کے لیے نہ صرف اپنے وطن سے ہجرت کر جاتا ہے بلکہ مذہب سے بھی منہ موڑ لیتا ہے۔ یہ میڈیکل ڈاکٹر اپنی پہچان بدلنے کے لیے امریکہ پہنچ کر خود کو ایک نئے نام سے متعارف کرواتا ہے تاکہ لوگ اس کے مہذب ہونے پر شک نہ کریں اور انسان دوست مان کر عزت سے نوازیں:

"اس کے لیے مذہبی طرزِ احساس فقط رجعت پسندی، جہالت اور ذہنی پسماندگی کا شاخسانہ

تھا۔۔۔لہذا وہ مذہب اور اس کے متعلقات کو ایک لایعنی گورکھ دھندا قرار دیتا اور خود کو ہمیشہ اس سے دور رکھا۔ اپنے شعبے سے کامل وابستگی نے اسے عجب طرح کا دلی سکون عطا کیا تھا۔۔۔اور وہ اس سے نہال تھا۔ یہی سبب ہے کہ جس شہر میں نام، مقام اور سکونِ قلب کا سرمایہ کما چکا تھا اور مسلسل کما رہا تھا، اسی کا مسلسل باسی ہو گیا تھا۔ ایک پسماندہ ملک کے بے وسیلہ، غیر مہذب اور جاہل لوگوں کے بے ہنگم اور بے اصول معاشرے میں رہنے سے بدرجہا یہ مناسب لگا کہ وہ یہیں انسانیت کی خدمت میں جتا رہے۔"(۶)

یہی وہ ڈاکٹر توصیف ہے جس نے انسانیت کی خدمت میں جتا رہنے میں اپنی بقا جانی اپنا نام 'توصیف' سے 'طاؤژ' میں بدل ڈالا۔ زبان سے انسانیت کی خدمت کے نعرے لگانا دوسری بات ہے مگر باطن سے اس پر کاربند ہونا دوسری بات ہے۔ جب انسان نظریاتی طور پر مضبوط نہ ہو اور کسی مضبوط ستون سے جڑا ہوا نہ ہو تو اس کا بے مرکز ہو کر جہاں کی گم نامی میں گم ہو جاتا معمولی سی بات ہے۔ اسی بات کا ثبوت ہم محولہ بالا میں دیکھ چکے ہیں۔

مادیت پر قائم رشتے:

مذہب ایک واحد نظریہ ہے کہ جس کی بنیاد پر قائم ہونے والے رشتے قربانی کے جذبے سے سرفراز ہوتے ہیں باقی تمام تعلقات وقت آنے پر کمزور اور متبدل ثابت ہوتے ہیں۔ توصیف سے طاؤژ کا نام بدلنے والا ڈاکٹر کیتھی سے شادی کرتے ہوئے شاید یہ بھول گیا تھا کہ جس خاتون سے وہ رشتہ جوڑ رہا ہے وہ اثاثی طور پر اس سے زمین اور آسمان جیسا افتراق رکھتی ہے اور وقت پڑنے پر کبھی بھی اس کی معاون نہیں بنے گی۔ نائن الیون کے واقعے کی زد میں جب ڈاکٹر طاؤژ کو گرفتار کیا گیا تو اس کی بیوی اور دو بچے کبھی بھی اس سے ملنے یا اس کی صفائی پیش کرنے نہ آئے۔ یہ رشتے خونی رکھ رکھاؤ اور جذباتی لگاؤ سے دور اور بے بنیاد اس وقت ثابت ہوتے ہیں جب وہ جیل میں ایک وکیل کے ساتھ ڈاکٹر طاؤژ کی ملاقات کے لیے آخری فیصلے پر دستخط لینے کے لیے آتے ہیں:

"صدیوں کا فاصلہ پوری شدت سے محسوس ہونے لگا تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ خود نہ آئے تھے ،انھیں لایا گیا تھا۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اندر سے باہر چھلکتی اکتاہٹ نہیں چھپائی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی اس نے افسوس کے ساتھ سوچا تھا، کاش کیتھی انھیں نہ لاتی۔۔۔اور جب ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تو اسی دکھ کی شدت کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا، کاش کیتھی کبھی نہ آتی۔ نہ دیکھنے کی خواہش کے ساتھ وہ جب آخری بار اسے دیکھ ہی رہی تھی تو وہ کیتھی کے یوں چلے آنا کا مدعا سمجھ چکا تھا۔ ان کا فیملی لائر کچھ پیپرز اگلے روز شام تک بنالایا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ڈی پورٹ ہونے سے پہلے ان پر دستخط کر دے۔"(۷)

امریکہ نے اپنی طاقت اور اپنا گھمنڈ دنیا پر جمائے رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کیے۔ ایک طرف امریکہ اپنا انسان دوستی والا نعرہ قائم رکھنا چاہتا تھا اور دوسری طرف مسلم ممالک کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر اسے دبا دینا چاہتا تھا۔ امریکہ مسلم ممالک سے مادی وسائل بھی ارزاں قیمت پر دبوچ لینا چاہتا تھا اور ان ممالک کا خیر خواہ بن کر ان پر مکمل اقتدار بھی حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ ایسے اثرات محمد حمید شاہد کے افسانے "موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ" میں آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

موصوف افسانہ نگار نے امریکہ کی سازش کو بے نقاب کیا ہے جو ایشیائی مسلم ممالک میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے داخل ہو رہے ہیں مگر ان کے داخلے کے بعد وہاں سے موت کی بوٹی کے پھوٹنے کے مناظر کا معائنہ کیجیے:

> "قدرے کم معروف اور بے ضرر لکھنے والے کے حصے میں جتنی تعزیتی قراردیں آسکتی تھیں اس کے حصے میں بھی آئیں۔ اس کام کا تذکرہ بھی ہوا، جو اگر چھپ جاتا تو اس کا نام زیادہ اہم ہو سکتا تھا۔۔۔ مگر فوراً بعد اس بارود کی بارش کا تذکرہ ہونے لگا جو افغانیوں کے بعد اب مسلسل عراقیوں پر برس رہی تھی۔۔۔ کہ یہ بارش جہاں برستی تھی وہاں سے موت کھمبیوں کی طرح اگ آتی تھی۔ اتنے بے پناہ مرنے والوں کے درمیان اس کی موت اکیلی ہو گئی۔۔۔ الگ۔۔۔ بالکل اکیلی۔ موت کے اس اپادھی موسم میں سفاک امریکا سارے اصول اور سارے ضابطے چھوڑ کر انتہائی بے حیائی سے یہ کہہ رہا تھا: "جو ہماری بات نہیں مانے گا اسے الگ تھلک کر کے رکھ دیں گے۔"(۸)

اس افسانے کے نام اور اس کے مختلف اقتباسات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے امریکا پوری دنیا پر اپنا اقتدار اور تسلط قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے امریکہ نے پوری دنیا کو موت منڈی بنا کر رکھ دیا۔ اس موت منڈی میں جو بھی ان کی بات نہیں مانتا تھا وہ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ امریکا نے ایشیائی مسلم ممالک کو اس قدر بے چین کر دیا کہ ان ایشیائی مسلم ممالک کے نوجوانوں میں سے پر سکون زندگی گزارنے اور ترقی کے حصول کا مادہ ہی غائب ہو گیا۔ جن نوجوانوں کی عمریں تعلیم حاصل کرنے، ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور دنیا کا مقابلہ کرنے کا جذبہ ہونا چاہیے تھا وہ نوجوان اندرونِ خانہ اور بیرونی جنگ میں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف نام نہاد جہادی تنظیموں کا حصہ بن کر زندگی کی بازی ہار رہے تھے۔ محمد حمید شاہد نے اپنے افسانے "مرگ زار" میں ایک ایسی ہی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس شہادت کے واقعات کو کچھ یوں نقل کرتے ہیں:

> "دعا کرنا امی، اللہ مجھے شہادت نصیب کرے۔ دعا کرنا بھائی، میں خدا کی راہ میں شہید ہو جاؤں۔ باجی دعا کرنا، اللہ مجھے شہدا کے قافلے میں شریک کرے۔ امی کے نام، بھائیوں کے نام اور بہن کے نام اس نے جتنے بھی خطوط لکھے وہ بس اسی تکرار پر تمام ہوتے تھے۔ لفظ شہادت کے ساتھ جو تقدس وابستہ تھا، اس کے باعث میں بغیر کچھ سوچے سمجھے آمین کہتا رہا مگر ہر بار یوں ہوتا تھا کہ یہ لفظ میرے ہونٹوں سے پھسلتے ہی مجھے بوکھلا دیتا۔"(۹)

عالمی طاقتوں نے جہاں خود کو مضبوط کرنا، دوسروں پر اقتدار کا تسلط جمانا اور اپنی روایات کی روح کو دوسروں میں پھونکنا اپنا فریضہ سمجھ رکھا ہے وہیں کمزور، ترقی پذیر اور مسلم ممالک کو اندرونی خانہ جنگی میں دھکیلنا بھی اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ یہ تو اکیسویں صدی ہے سموئیل پی ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب "تہذیبوں کا تصادم" میں اس بات کو واضح طور پر بیسویں صدی میں ہی یوں بیان کر دیا تھا:

> "مختلف تہذیبوں کی ریاستوں اور گروہوں کے درمیان تنازعے کی بنیادیں بڑی حد تک وہی ہیں جنھوں نے ہمیشہ گروہوں کے مابین تنازع پیدا کیا ہے: افراد، زمین، دولت اور وسائل پر قبضہ اور تقابلی طاقت یعنی اپنی اقدار، ثقافت اور اداروں کو دوسرے گروہ پر ٹھونسنے کی کوشش بمقابلہ

دوسرے گروہ کی ایسا کرنے کی طاقت کے۔ تاہم ثقافتی گروہوں کے مابین تنازعے میں ثقافتی معاملات بھی شامل ہو سکتے ہیں۔"(۱۰)

محمد حمید شاہد دنیا میں رونما ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھنے والے ایک ایسے ناظر ہیں جو ان واقعات کی ویڈیو اپنی آنکھوں کے کیمرے سے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیتے ہیں اور پھر انہی واقعات کو تخیلی انداز اور علامتی زبان کے ذریعے دلچسپ کہانی میں پرو کر بیان کرتے ہیں جن سے قاری نہ صرف حظ اٹھاتا ہے بلکہ اہم معلومات بھی حاصل کرتا ہے۔

نائن الیون ایک ایسا واقعہ تھا جس نے عامی سیاست کو متاثر کیا وہیں عالمی ادب کو بھی اپنی لپیٹ میں اسی طرح لیا۔ اردو ادب کے ہر ادیب اور ناقد نے اس واقعے کو اپنے مشاہداتی تجربے، تخلیقی جوہر اور ناقدانہ نگاہ کے مطابق بیان کیا۔ اردو زبان کے ادیبوں کے اسی جوہر ڈاکٹر نجیبہ عارف یوں بیان کرتی ہیں:

"یہاں اس بات پر بحث کرنا مقصود نہیں کہ یہ رویہ کس حد تک جائز اور یکطرفہ ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب بھی ملک سیاست یا معاشرتی زندگی کے افق پر کوئی قابل ذکر واقعہ رونما ہوا، اُردو ادیبوں نے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے۔" (۱۱)

محمد حمید شاہد نے عالمی سطح کے اس واقعے کو نہ صرف اپنے تخلیقی جوہر میں سمویا بلکہ ایک باریک بین ناقد کی طرح اس کے اثرات کو بھی اپنی افسانوی تحریروں میں واٹر مارک کی طرح چسپاں کر دیا۔ محمد حمید شاہد نے اپنے ارد گرد کے حالات پر خوب نظر رکھی ہوئی ہے اس لیے ان کی ہر تحریر عصر حاضر کے واقعات کو ایک نیوز کاسٹر کی طرح بیان کرتی نظر آتی ہے۔

آرمی پبلک سکول پشاور کا سانحہ:

پاکستان کی تاریخ کا یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس پر ہر آنکھ نے آنسو بہائے، ہر ادیب نے اپنی تحریروں میں دلی جذبات بیان کیے اور شاعر نے منظر کشی کی لیکن پھر بھی درد کم ہوا، نہ پرانا ہوا اور آج بھی ہر دل اور ہر آنکھ میں ویسے ہی محفوظ اور تازہ ہے۔ بچے انسانی باغ کے ایسے پھول ہیں جن کی حفاظت ہر مذہب کے بنیادی حقوق میں سے ایک ہے۔ آرمی پبلک سکول کے معصوم بچوں پر ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو ٹوٹنے والے غم کے پہاڑ کو محمد حمید شاہد نے اپنے لفظوں میں دلی جذبات کے ساتھ یوں بیان کیا ہے اس کہانی کے ہر لفظ سے غم اُمڈ کر باہر آ رہا ہے۔ "خونی لام ہوا قتلام بچوں کا" میں توقیر نامی ایک معصوم بچے کی موت کے ذریعے پشاور سکول والے سانحے کو بیان کیا ہے۔ اس واقعے میں توقیر نامی ایک بچے کی موت نے گھر کا سارا سکون چھین لیا بلکہ ماضی کی خوشیوں بھی بے معنی ہو کر رہ گئیں:

"بیٹا انیس، جس عمر میں تمہارے ابا کے سر پر سنہرے تاروں والا سہرا سجا تھا عین اس عمر میں تمہارے معصوم بیٹے کی لہو میں لتھڑی ہوئی لاش میں نے اس گھر کے صحن میں دیکھی ہے۔ ہائے کہ یہ لاش دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی تھی۔"(۱۲)

آرمی پبلک سکول کے واقعے کی تفتیش کا کام آرمی کے انتہائی حساس اور ذہین ادارے انٹیلی جینس کے ذمے لگایا گیا، اس نے انتہائی باریک بینی اور ذمہ داری سے اس واقعے میں ملوث افراد کی اور ان کی پشت پناہی کرنے والے اداروں کی پہچان کا کارنامہ سر انجام دے کر عوام کو نہ صرف معلومات بہم پہنچائی بلکہ عوام کو اس قابل بنا دیا کہ وہ طالبان جیسی نام نہاد جہادی تنظیم سے نفرت کرنے لگے:

"اسی طرح جب سے افغانستان میں شورش شروع ہوئی تب سے وہ جہادی تنظیموں کی کاروائیوں کو خلاف اسلام کہتے آئے تھے۔ پہلے پہل انھیں روسی ایجنٹ کہا گیا اور جب روس پسپا ہو گیا اور دیکھتے

ہی دیکھتے مجاہدین دہشت گرد ہو گئے تو وہ اسی مولوی کی نظر میں وہ امریکی ایجنٹ ہو گئے مگر ان کا موقف بدلنا تھا نہ بدلا۔ وہ کہتے تھے کہ نجی جہاد کا یہ عملانار کی اور تباہی کے نتائج لائے گا اور سب نے دیکھا، ایسا ہی ہوا تھا۔" (۱۳)

امریکہ ایک ایسا مفاد پرست ملک ہے جس نے ہمیشہ ہر کسی کو اپنے مطلب تک استعمال کیا اور بعد میں استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح لاوارث کر کے پھینک دیا۔ امریکہ نے افغانی نوجوان اور جوشیلے طالبان کے ساتھ بھی یہی کیا ان کو روس کے خلاف استعمال کیا اور جب روس کو توڑنے میں اور اپنی طاقت کا سکہ جمانے میں کامیاب ہو گیا تو افغانی طالبان کی پشت سے اپنا ہاتھ اٹھالیا۔ طالبان نے امریکہ سے تو ماتھا لگایا جس قدر وہ لگا سکتے تھے مگر اپنی ہزیمت اور خسارے کا بدلہ امریکہ سے لینا طالبان کے بس کی بات نہیں تھی۔ افغانستان کے لوگوں نے یہ بات اپنے دل میں ثبت کر لی تھی کہ پاکستان نے امریکہ کو اڈے دے کر افغانستان تک رسائی دی ہے اور افغانستان کے کچھ جذباتی جہادی تنظیموں کا حصہ بن کر پاکستان میں بدامنی پھیلا رہے تھے۔

بلوچستان کی بدامنی اور بلوچ تحاریک

بلوچستان پاکستان کا رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے مگر مقامی وڈیروں اور نواب شاہی نظام کی وجہ سے وہاں پر ابتدا دن سے انتظامی امور میں مسائل کا سامنا رہا ہے۔ بلوچستان کے بارڈرز کے کچھ علاقے پاکستان کے دارالخلافہ سے دور اور دشمن کی رسائی کے اس قدر قریب تھے کہ وہ وہاں کے مقامی باشندوں کو ورغلا کر ان سے ملک و قوم کے خلاف کوئی بھی کام لے لیتا تھا۔ بلوچستان کے عوام بھی اس قدر سادہ تھے وہ دشمن کی ابلیسی چال بازیوں میں آ کر اپنے اور ملک کے خلاف بھڑک اٹھتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اگر صوبہ بلوچستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں ہر دور میں کوئی نہ کوئی تحریک سرگرم عمل رہی ہے۔ محمد حمید شاہد بھی اپنے افسانے "کوئٹہ میں کچلاک" میں اکیسویں صدی کی کچھ ایسی ہی تحاریک کی نشاندہی کی ہے جن تحاریک کے ارکان نے بیرونی سازشوں کے ہتھے چڑھ کر ملک و قوم کو خوب نقصان پہنچایا ہے۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بلوچ باشندے اکبر بگٹی کے قتل کے بعد فوج اور پنجابی عوام کے اس قدر خلاف ہو چکے تھے کہ جہاں بھی ان کو کسی پنجابی یا فوجی کا سراغ ملتا فائرنگ شروع کر دیتے:

"طلال رند نے کھنگار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن میری طرف کرتے ہوئے کہا: "صاحب آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہمیں آپ کی جان عزیز ہے۔ ہمیں جو کہنا تھا وہ ہم درخواست میں لکھ چکے۔ اس پر تفصیل سے بات بھی ہو سکتی تھی کہ اسی لیے تو ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں مگر ادھر کچلاک میں گولی چل گئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے لیے یہاں تک سفر کر کے آنے والے ہمارے مہمان کسی مشکل میں پڑ جائیں گڑبڑ سارے علاقے میں پھیل سکتی ہے، اگر ایسا ہوا تو سارے راستے بند ہو جائیں گے۔" (۱۴)

بلوچستان میں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے آخری کچھ سال اور دوسری دہائی کے ابتدائی کچھ سال ایسے تھے کہ پنجابی یا کسی سرکاری ہرکارے کا بلوچستان میں جانا جانی خطرے سے کم نہ تھا۔ ۴ مئی ۲۰۱۰ء کو بی بی سی نے اپنی ایک رپورٹ شائع کی جس میں انھوں نے شہباز شریف اور عطااللہ مینگل کی ملاقات میں بلوچستان میں پنجابیوں کے قتل کو روکنے کے حوالے سے بات کی ہے:

"مسلم لیگ نواز کے سربراہ اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف نے بزرگ بلوچ قوم پرست رہنما سردار عطااللہ مینگل سے ملاقات کی ہے، جس میں انھوں نے سردار مینگل سے اپیل

کی کہ وہ بلوچستان میں پنجابی بولنے والوں کی ٹارگٹ کلنگ روکنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ میاں شہباز شریف پنجاب میں سرمایہ کاری کے لیے کراچی میں منعقد کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے، منگل کو لاہور روانگی سے قبل انہوں نے سردار عطااللہ مینگل کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد شہباز شریف کا کہنا تھا کہ بلوچستان کے بارے میں پالیسیوں پر سردار عطااللہ مینگل کے شدید تحفظات ہیں اور کافی ناراض ہیں۔"(۱۵)

صوبہ بلوچستان کے باشندے کبھی بیرونی دشمن کی سازش کی کمان کا تیر بن جاتے ہیں تو کبھی اپنوں ہی کے ہاتھوں بہک جاتے ہیں۔ ایسی ہی صورتحال ہمیں محمد حمید شاہد کے افسانوں سے نمایاں ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ یہ عوام جو اس قدر بپھرے ہوئے ہیں اور سرکاری ہرکاروں اور پنجابی لوگوں کو دیکھتے ہی ان پر کود پڑتے ہیں دراصل اس بار اپنے بزرگ نواب اکبر بگٹی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ وہی عوام ہیں جو کل تک تو کہتے تھے کہ اکبر بگٹی بڑا ظالم ہے اور وہ ان کے بنیادی حقوق بھی ضبط کیے ہوئے اور بلوچستان کے سرکاری وسائل کو بھی اپنی وراثت سمجھ کر ہڑپ کر رہا ہے مگر اکبر بگٹی کی مخالفت کرنے یا اس کے خلاف آواز بلند کرنے کا یارا ان میں نہ تھا۔ یہ عوام بھی کس قدر مجبور و مفلوج ہیں جو اکبر بگٹی کو اس کی زندگی میں تو ظالم سمجھتے تھے مگر جونہی وہ مارا جاتا ہے تو کسی کی سازش میں آکر اس کا بدلہ لینے کے لیے متحرک ہو جاتے ہیں۔ اکبر بگٹی کے ظلم ستم کے حوالے سے موصوف افسانہ نگار لکھتے ہیں:

"اسی پچھلے دورے میں اس نے بتایا تھا کہ نواب اکبر بگٹی نے اپنے مخالفین پر کیسے کیسے ظلم و ستم ڈھائے تھے۔ اس نے کچلاک سے گزرتے ہوئے تب مجھے وہی سنایا تھا، جو شاید میں سننا چاہتا تھا۔ کالپرز اور ماسوریز قبائل کا اس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اپنے اپنے علاقے چھوڑ جانا اور سندھ میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارنا یا پھر تعلیمی اداروں کے قیام اور ترقیاتی منصوبوں پر کام کی مخالفت اور رکاوٹیں ڈالنا، سوئی کے مقام سے گیس کا نکلنا اور اربوں کی رائیلٹی کا اینٹھنا؛ کم ملنے پر بپھر جانا اور بلیک میلنگ کے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آنا۔"(۱۶)

یہ بلوچستان کے سادہ لوح انسان ہیں جو بڑے لوگوں کی برائیوں کو جان کر اونچی آواز نہیں نکال پارہے اور ان کے سامنے ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں، بات صرف تعریف کی حد تک ہی نہیں بلکہ جب وڈیروں کی طرف سے کوئی اشارہ آجائے تو یہ لوگ حقائق جانے بغیر ان پر جان فدا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی صورتحال اکبر بگٹی کے قتل کے بعد سامنے آئی جب بلوچ عوام سڑکوں پر نکل آئے سرکاری املاک، افواج اور پنجابیوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس کا کچھ بھی نفع بخش حاصل نہ تھا نقصان اور صرف نقصان تھا، اس جنگ میں ان لوگوں کی زندگیوں کو موت کا مہمان بنایا جارہا تھا جو پہلے ہی غربت کی وجہ سے زندگی اور موت کے بیچ کہیں ڈبکیاں کھارہے تھے۔ ان غریب اور سادالوح لوگوں کو جب وڈیرے اپنے ہتھے چڑھا لیتے ہیں تو پھر ان کو چاہے جس راستے پر لگا دیں یہ لوگ لگ جاتے ہیں اور انھیں اس راستے کی ابتدا اور انتہا کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اسی طرح ان لوگوں کی زبان پر آزاد بلوچستان کا نعرہ لاگو کر دیا گیا جس کے بعد ان لوگوں نے ایک بار بھی نہیں غور کیا کہ اس کا مقصد کیا ہے اور اس نعرے کے نقصانات کیا ہیں۔ اس حوالے سے موصوف افسانہ نگار کے افسانے "کوئٹہ میں کچلاک" کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"ہاں بہ ظاہر آزاد بلوچستان ایک مقصد ہو سکتا ہے ان سب کا۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے اور کیا سب اس پر راضی ہو پائیں گے۔" اس نے نقشہ پورے مانیٹر پر پھیلا لیا۔ اب میں اس نقشے کے نیچے کا نوٹ پڑھ

سکتا تھا کہ گریٹر بلوچستان کا یہ نقشہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کراچی سے چھپنے والے ایک ہفت روزے "البلوچ" نے صفحہ ۷ پر چھاپا تھا۔ اس کے بعد تاریخ اور جغرافیہ نے کئی کروٹیں لیں۔ ان علاقوں میں کہ جہاں کا یہ نقشہ ہے وہاں بھی بہت کچھ بدلا مگر تب سے اب تک اس نقشے کو آزاد بلوچستان والے استعمال کرتے آئے ہیں۔"(۱۷)

آزاد بلوچستان کے نعرے لگانے والے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کے ہاں نقشہ کون سا ہے اور یہ نقشہ ان کو کن ہاتھوں سے کن شرائط پر ملا ہے مگر یہ سادہ لوح بلوچ ظاہری طور پر اپنے وڈیرے کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ان پر ظلم کرنے والی ان کی اپنی حکومت اور اسی ملک کے دوسرے بااثر شہری ہیں۔ سادہ لوح بلوچ بھی اصل حقیقت سے ناآشنا ہیں اور اس ملک کے دیگر باشندے بھی حقائق سے نابلد ہیں کہ یہ لوگ کن ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے ہوئے ہیں اور اس کے پس پردہ حقائق کیا ہیں۔ موصوف افسانہ نگار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"امریکہ والے بلوچستان کے باغیوں کی نہ صرف حمایت کرتے ہیں انہیں اور گہرا وار کرنے پر اکساتے بھی ہیں۔ سارے باغی سوئٹزر لینڈ میں جاکر جمع ہو جاتے ہیں۔ ہیر بیار مری، سلمان داؤد، مہراب بلوچ، ڈاکٹر مصطفیٰ بلوچ اور بہت سارے۔ بلوچ ریپبلکن آرمی والے افغانستان میں پھنسے ہوئے برہمداغ کے بھی وہاں رابطے ہیں۔ امریکہ کے تھنک ٹینک سی آئی اے کی نگرانی میں ان کی معاونت کر رہے ہیں۔ میڈیا والوں کو ساتھ دینے کو کہا گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی بھی وقت آزاد بلوچستان کا سوئٹزر لینڈ میں اعلان ہو جائے گا۔"(۱۸)

پاکستان دنیا کی ایٹمی طاقتوں میں سے ایک ہے اور پاکستان کے پاس دنیا کی تربیت یافتہ ترین افواج میں سے فوج ہے، ان سب قوتوں پر استزاد پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور اسلام کا باطنی جذبہ اس مسلم قوم کے پاس فراواں ہے۔ ان سب باتوں کی بنیاد پر دشمن کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ سامنے آکر حملہ کرے یا پھر پاکستان کے بارے میں اپنی ناپاک پالیسی واضح کرے۔ ان سب کمزوریوں کے باعث شیطانی حربوں کا استعمال کرتے ہوئے کبھی سادہ لوح بلوچوں کو ورغلاتا ہے اور کبھی افغانستان کے نام نہاد مجاہدوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ نابلد بلوچ عوام کو بھی کبھی تعلیم کے نام پر ویزے دے کر اور کبھی کام کا جھانسا دے کر پاکستان سے نکالنا اور پھر ان کو وہاں پر آزادی کی ترغیب دینا بھی امریکہ کا اپنا ہی مفاد ہے۔ امریکہ کی مثال ایک ایسے کوے کی سی ہے جو بچوں کے ہاتھ سے بسکٹ چھیننا بھی چاہتا ہے مگر یہ بھی سوچتا ہے کہ میرے حملے کا بچے کے ماں باپ میں سے کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو۔ امریکہ کی مکاری کے پیچھے غصے و حرص کی آگ یکساں شدت سے الاؤ جلائے ہوئے ہے۔ نائن الیون کے واقعات نے امریکہ مسلم دنیا کا کھلا دشمن بنا دیا ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

"ان کے لیے گیارہ ستمبر کا دن ایک نیا پیغام چھوڑ گیا ہے۔ ایک تناظر ان دو تین مخصوص ممالک کے عوام کا بھی ہے، جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے کوسوں دور واقع ہیں، جن کا کوئی براہ راست تعلق اس واقعے ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا مگر اس کے نتائج کا سب سے ہولناک اثر ان کی زندگی پر ہوا۔ ان میں ابھی تک عراق، افغانستان اور پاکستان شامل ہیں۔ ایران کب سینہ چاکان چمن سے آملے، اس

بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پاکستان بہر طور پہلے دن سے اس کا حصہ یا نشانہ رہا ہے۔"

(۱۹)

گیارہ ستمبر کے واقعے کا مسلم دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا تاہم امریکہ کے حرص کی آگ بدلے کی ہوا سے مزید تیز ہو گئی اور اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ مسلم دنیا پر نہ صرف اپنا تسلط جمایا جائے بلکہ ان کو نقصان بھی پہنچایا جائے۔ مذکورہ بالا ممالک کو کمزور کرنے کے لیے امریکہ نے ان ممالک میں اندرونی خلفشار کا آغاز کیا، کمزور ایمان کے مالک، غدار اور جھوٹے وقار کے طلب گار امریکہ کے بچھائے گئے جال میں پھنستے چلے گئے اور اپنے ممالک کو نقصان پہنچاتے چلے گئے۔ درج بالا اقتباسات میں اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائی کے بلوچستان کی حالت کا بغور تجزیا کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بلوچستان میں آزاد بلوچستان کی تحریک ہو، انڈیا کے ساتھ ہاتھ ملانے کی بات ہو یا پھر سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کی بات ہو، بلوچستان کی ان تمام آوازوں کے پیچھے دشمن کی سازش نظر آئی ہے۔ امریکہ کی طرف سے پیش کیے گئے لالچ نے برسوں سے آپس میں ناراض بلوچوں کو آپس میں یک جان کر دیا:

"میں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ بلوچ لیڈر آپس میں گلے ملے ہوں، اس طرح۔ مگر یہ آپس میں مل رہے ہیں۔ جی، ان کی سو سال سے، باپ دادا سے، اور اجداد سے دشمنیاں چل رہی ہیں مگر امریکہ نے انھیں آپس میں ملا دیا ہے؛ یہ کمبائن ہو گئے ہیں؛ یونائٹڈ۔ سو سال کے دشمن اس امریکہ کی وجہ سے مل گئے ہیں۔"(۲۰)

یہاں پر امریکہ کی گھناؤنی حرکتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں کہ اس نے اندرونی خانہ جنگی پیدا کر کے اپنا مفاد چٹکانا چاہا۔ امریکہ کا مفاد سب کے سامنے تھا کہ پاکستان میں اڈے حاصل کر کے افغانستان میں اپنے قدم جمائے جائیں۔ انڈیا براہ راست اس اندرونی بدامنی میں شامل نہیں تھا مگر امریکہ کے ہاتھ بلوچوں کو بکنے کے لیے تیار کرتا تھا تاکہ پاکستان کمزور ہو جائے۔

ماحصل:

محمد حمید شاہد نے اپنے افسانوں میں جس قدر باریک بینی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان فن پاروں کو پڑھنے والا قاری بھی دو گروہوں میں بٹ جاتا ہے، محظوظ ہونے والا قاری تو شاید صرف خارجی تاثر لے کر ہی خاموش ہو بیٹھے مگر ادب کی سمجھ رکھنے والا اور فن پاروں کے باطن میں جھانکنے والا قاری ان فن پاروں کی ایک ایک سطر سے معنی کا ایک نیا جہان دریافت کرے گا۔ موصوف افسانہ نگار نے کمال درجے کی فنی مہارت سے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ خود کو امن کا داعی اور انسانیت کا علمبردار کہلوانے والا امریکہ انسانیت کے معیار سے کس قدر گر چکا ہے۔ امریکہ نے بغیر کسی مستند ثبوت کے نائن الیون کے واقعے کا چند کمزور مسلم ممالک کو ذمہ دار ٹھہرا دیا اور پھر ان ممالک کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر طرح کے منفی ہتھکنڈوں کا استعمال کیا۔ امریکہ چاہتا تھا کہ ایک طرف تیل کے حامل مسلم ممالک کو اپنے قبضے میں لیا جائے اور دوسری طرف اہم بحری راستے رکھنے والے مسلم ممالک کو قابو کیا جائے تاکہ دنیا پر غلبہ حاصل کیا جاسکے۔ پاکستان گوادر جیسی اہم ترین بندرگاہ کا حامل ملک ہے جس کی قدر و قیمت سے امریکہ بھی آگاہ ہے اور چاہتا ہے کہ اس بندرگاہ کے ذریعے سے اپنی افواج اور جنگی سامان کو ترقی پزیر ممالک میں داخل کر کے ان کی معیشت اور ثقافت پر اپنا حق قائم کر لیا جائے۔ امریکہ نے معیشت کے ساتھ ساتھ ثقافت پر غلبہ پانا بھی اپنا ٹارگٹ بنا رکھا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حامد بیگ مرزا، اردو افسانے کی روایت، عالمی میڈیا، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵

۲۔ گوپی چند نارنگ پروفیسر، اردو افسانہ روایت اور مسائل (مرتبہ)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعت پنجم ۲۰۱۳ء ص ۱۲۹

۳ ۔ ایضاً ص ۴۹۵

۴۔ احمد ندیم قاسمی، مشمولہ (مرگ زار)، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء ص ق

۵۔ محمد حمید شاہد، گانٹھ، مشمولہ (مرگ زار) اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء ص ۷۹

۶۔ ایضاً ص ۸۲

۷۔ ایضاً ص ۸۴

۸۔ محمد حمید شاہد، موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ، مشمولہ (مرگ زار)، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء ص ۱۰۸

۹۔ محمد حمید شاہد، مرگ زار، مشمولہ (مرگ زار)، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء ص ۱۴۰

۱۰۔ سموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، مترجم (سہیل انجم)، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء ص ۱۵۹

۱۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، 9/11 اور پاکستانی اُردو افسانہ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۱ء، ص، ۲۱۔۲۲

۱۲۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، مشمولہ (دہشت میں محبت)، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۲۱

۱۳۔ ایضاً ص ۲۴

۱۴۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک، مشمولہ (دہشت میں محبت)، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۳۹

۱۵۔ اردو نیوز BBC، ۴ مئی ۲۰۱۰، پاکستان، صفحہ اول

۱۶۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک، مشمولہ (دہشت میں محبت)، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۴۱

۱۷۔ ایضاً ص ۴۶، ۴۵

۱۸۔ ایضاً ص ۴۷

۱۹۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، 9/11 اور پاکستانی اُردو افسانہ، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲

۲۰۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک، مشمولہ (دہشت میں محبت)، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۴۹

References in Roman Script:

1. Hamid bag Mirza ,urdu afsaney ki riwayat, aalmi media, nai Dehli ,2014,p:15
2. gopi chand narang professor, urdu afsana riwayat aur masail (martaba), educational publishing house, ashaat panjum 2013,p:129
3. Ibid,p :495
4. Ahmed Nadim qasmi, included (merg zaar), akadmi bazyaft, Karachi ,2004,Flap

5. Mohammad hamid Shahid , ganth, included (merg zaar) akadmi bazyaft, Karachi , 2004,p:79
6. Ibid, p:82
7. Ibid, p:84
8. Mohammad hamid Shahid , mout manndi mein akeli mout ka qissa, (merg zaar),acadmi bazyaft,
9. Mohammad hamid Shahid , merg zaar, included (merg zaar), akadmi bazyaft, Karachi , 2004, p: 140
10. Samuel Hungtin, tehzibon ka tassadum, mutrajim (Sohail Anjum), avksford university press, Karachi , 1997, p: 159
11. Najiba arif, dr, 9 / 11 aur Pakistani urdu afsana, Islamabad : purab akadmi, 2001, p: 21-22
12. Mohammad hamid Shahid , khooni laam,hua qatlam bachon ka, included(dehshat mein mohabbat), Zahid Basheer printers, Lahore , 2015, p: 21
13. Ibid, p : 24
14. Mohammad hamid Shahid , queta mein kchlak, included (dehshat mein mohabbat), Zahid Basheer printers, Lahore , 2015, p: 39
15. Urdu News bbc,may4,2010 , Pakistan , p: 1
16. Mohammad hamid Shahid , queta mein kchlak, included(dehshat mein mohabbat), Zahid Basheer printers, Lahore , 2015, p: 41
17. Ibid, p:45-46
18. Ibid, p:47
19. Najiba arif, dr, 9 / 11 aur Pakistani urdu afsana, Islamabad : purab akadmi, 2001, p:12
20. Mohammad hamid Shahid , queta mein kchlak, included (dehshat mein mohabbat), Zahid Basheer printers, Lahore , 2015, p: 49